© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمد ریاض

تصانیفِ اقبالؔ —— دیباچے اور سرنامے

اہم شعرا اور مصنفین کی تصانیف کا ہر پہلو توجہ طلب ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں اب کی بار راقم الحروف کو تصانیفِ اقبالؔ کے مقدموں، دیباچوں اور سرناموں سے مختصر بحث کرنا مقصود ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ تصانیفِ اقبالؔ کے دیباچے اور سرنامے خاصے گرہ کشا ہیں۔ خصوصاً علامہ مرحوم کی موخر تصانیف کے سرنامے۔ اقبال شناسوں کو ان پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم علامہ ممدوح کی اردو، انگریزی اور فارسی تصانیف پر اس جہت سے ایک اجمالی نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ علم الاقتصاد

اقبال کی یہ پہلی مستقل تصنیف ہے جو ۱۹۰۳ میں لاہور سے شائع ہوئی تھی اور کوئی ۵۸ سال بعد ۱۹۶۱ میں اقبال اکادمی کے توسط سے اس کی اشاعتِ ثانی بھی ہوئی۔ علم الاقتصاد کو اردو میں علمِ سیاستِ مدن، لکھتے رہے ہیں، مگر اب یہ "معاشیات" سے موسوم ہے۔ تاہم عربی اور فارسی میں اب بھی اکنامکس کو علم الاقتصاد ہی کہتے ہیں۔ "علم الاقتصاد" یعنی "دی سائنس آف اکنامکس" اور اب تو معاشیات بڑی حد تک ایک سائنسی موضوع تسلیم ہو چکا ہے۔ اقبال نے کتاب کا ایسا نام لکھا ہے جو اس کے موضوع کا معرّف ہے۔ اسے پڑھ یا سن کر موضوع کتاب خود بخود ذہن میں مرتسم ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اپنی "علمی کوششوں کا پہلا ثمر" جناب ڈبلیو بل اسکوائر ناظم تعلیماتِ پنجاب کو پیش کیا تھا۔ موصوف گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے تھے۔

اس کتاب پر اقبال کا دیباچہ، اشاعتِ ثانی کے مطابق، کوئی چار صفحے کا ہے۔ آغازِ گفتار اس طرح ہے: "علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار سے بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔" [۱]

---

[۱] علم الاقتصاد۔ شائع کردہ اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۱، صفحہ ۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاشیات اقبال کا ایک پسندیدہ اور محبوب موضوع رہا ہے۔ گو ان کی آزادانہ اور قلندرانہ زندگی اس موضوع کی نزاکتوں سے میل کھاتی نظر نہیں آتی۔ معاش اور معاشیات زندگی کے اہم ترین امور میں سے ہیں۔ اسی لیے اقبال کو اس علم سے دلچسپی تھی۔ وہ قیام یورپ کے دوران (۱۹۰۵-۱۹۰۸) معاشیات کی کلاسوں میں ایک آزاد محقق کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کے مجموعوں میں اسلامی اصولِ معاشیات سموئے ہوتے ہیں، مگر یہاں ان امور سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ اقبال کی اس کتاب کا دیباچہ علم معاشیات کا اردو میں پہلا تعارف پیش کرتا ہے۔ بظاہر یہ اردو میں اس موضوع پر ابتدائی کتابوں میں سے ہے اور اسی لیے مصنف کو وضع تراکیب و اصطلاحات کے لیے غیر معمولی محنت کرنا پڑی ہے۔ انھوں نے بعض اصطلاحات کو مصر کے عربی اخباروں سے اخذ کیا اور بعض کو خود وضع کیا، مگر علم الاقتصاد کے مسودے کے بعض حصوں پر شمس العلما علامہ شبلی نعمانی مرحوم (م ۱۹۱۴) نے بھی اصلاح کی تھی۔ مصنف کو اعتراف ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کی تحریک ان کے استاد ڈاکٹر سر طامس آرنلڈ (م: ۱۹۳۰) نے کی اور انھوں نے میاں فضل حسین (م: ۱۹۳۶) کے کتب خانے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ علم معاشیات پر گزشتہ صدی میں انگریزی زبان میں کافی اہم کتابیں لکھی گئی تھیں اور اقبال نے انھیں مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس علم کو اردو میں منتقل کرنے کے متمنی ضرور رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک ماہر معاشیات یا مفکر اقتصاد دان کے طور پر معاشیات کے نظری مباحث کو برصغیر کے خاص حالات پر منطبق کیا ہے اور ان کا یہ کمال آج تک موجب اعجاب حیرت بنا ہوا ہے۔[۲] خود مصنف لکھتے ہیں: "... یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے، مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا..."

جن مباحث کے بارے میں اقبال نے بطور خاص اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان میں برصغیر کی تجارتی حالت اور یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا خطرہ، نمایاں تر ہیں۔ اقبال اس کتاب میں تحدید

۲۔ دیکھیے اس کتاب پر ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کے پیش لفظ اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی کے مقدمے میں شواہد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اولاد کے مؤید ہیں - اخذ و اقتباس، ترجمے اور وضعِ تراکیب و اصطلاحات کے سلسلے میں اقبال ایک منفرد مقام رکھتے ہیں - چنانچہ علم الاقتصاد میں استعمال شدہ اصطلاحات کی اکثریت اردو میں علمِ معاشیات پر لکھی جانے والی کتب میں بھی مستعمل ہو رہی ہے - مگر حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی یہ تصنیف، خاصی غیر معروف رہی ہے ورنہ معاشیات کے مصنفین اسے یقیناً درخورِ اعتنا جانتے - اب بھی یہ کتاب کم یاب ہے حالانکہ اقبال کے بارے میں رطب و یابس کتب کا ایک طومار جمع ہو رہا ہے - اقبال سے تعلق کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب وافر مقدار میں موجود ہو اور اسے جامعاتِ پاکستان کی حوالے اور زائد مطالعے کی کتب میں ضرور شامل کیا جاتے - دیباچۂ کتاب میں بتایا ہے کہ علم الاقتصاد سے آگاہی عروجِ ملل کا ایک سبب ہو سکتی ہے اور اس سے جہالت، زوالِ قومی کا ایک ذریعہ پھر علم الاقتصاد اگرچہ افلاس و عزبت کو دور کرنے کا کوئی نسخۂ کیمیا نہیں مگر یہ علم اس امر پر سوچ بچار کو دعوت تو دیتا ہے کہ "... کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ ..." مگر مصنف کو علم ہے کہ علم الاقتصاد انسانی ہمدردی کی تعالیم سے عاری ہے - یہ اصول مذہب ہیں جنھوں نے انسانی ہمدردی اور باہمی تعاون و نصرت کا درس دیا ہے - بعد کی تصانیف میں اقبال برملا فرماتے رہے ہیں کہ عالمی اخوت اور حقیقی باہمی دل سوزی کی حامل صرف اسلامی مدنیت ہے -

۲- ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا (انگریزی)

یہ کتاب اقبال کا ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے لیے تحقیقی مقالہ ہے جس پر نومبر ۱۹۰۷ میں میونخ یونیورسٹی (جرمنی) نے انھیں پی - ایچ - ڈی کی ڈگری دی - چند ماہ بعد ۱۹۰۸ میں یہ کتاب لندن سے شائع ہو گئی تھی - اس کے بعد اب تک یہ متعدد بار شائع ہوئی ہے - پاکستان میں اس کی اشاعت کا اہتمام بزمِ اقبال لاہور کرتی رہی ہے -

ڈاکٹریٹ کے مقالے طالبِ علمانہ کوششیں ہوتی ہیں - بہت کم مقالے تحقیقی کتابوں کی پختگی اور عمق کے حامل ہوتے ہیں، مگر اقبال کی یہ کتاب اعلیٰ استثنائی مقالوں میں سے ہے - ای - جی براؤن

© rasailojaraid.com

(م۔۱۹۲۶ء) نے تاریخ ادبیات ایران کی چوتھی جلد میں اس کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے اسے مجمل مگر بلند پایہ کتاب قرار دیا تھا[3]۔ ۱۹۲۷ء میں یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہو رہی تھی اور اقبال اس کی اشاعت کے چنداں حامی نہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کتاب کو لکھے ہوئے برسوں کی دہائیاں گزر گئیں اور ان کے افکار بہت کچھ بدل چکے، مگر اس بات پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ایرانی مابعد الطبیعیات کے کلیات پر اس سے بہتر کتاب اب تک نہیں لکھی گئی (حتیٰ کہ ایران میں اور بزبان فارسی بھی)۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ فلسفۂ عجم کے نام سے متداول ہے۔ فارسی ترجمہ ۱۹۶۷ء میں تہران سے شائع ہوا تھا اور اب تک اس کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ مترجم ڈاکٹر امیر حسن آریان پور ہیں۔ انھوں نے کتاب کا نام سیرِ فلسفہ در ایران، رکھا۔ اوپر ان ہی کی رائے نقل ہوئی ہے کہ ایرانی مابعد الطبیعیات پر اس سے بہتر کتاب ہنوز نہیں لکھی جاسکی[4]۔

اقبال نے کتاب کی چھ فصول قائم کر کے ایران کے قدیم و جدید مابعد الطبیعیات (یعنی فلسفہ اور افکارِ دین وغیرہ) کو واضح کیا ہے مگر ان کا مختصر مقدمہ بے حد دلچسپ ہے۔ اس میں انھوں نے عربی اور فارسی کی کوئی بیس کتابیں گنوائی ہیں جو ان کے منابعِ تحقیق تھیں۔ ان کی کتابوں سے فلسفے، تصوف اور علم کلام کے موضوعات واضح ہیں۔ اقبال کی کتاب میں کشف المحجوب بھی مصادرِ تحقیق میں شامل ہے، مگر متن میں اس کا کوئی حوالہ موجود نہیں ہے۔ ثانوی مآخذ میں شبلی کی الکلام، علم الکلام اور الغزالی بھی شامل ہیں۔

اقبال لکھتے ہیں کہ ایران کے لوگ فلسفے کے دلدادہ رہے ہیں۔ مگر چین یا ہندوالوں کی طرح ان کا کوئی منتظم فلسفہ نہیں ہے۔ ایرانی فلسفے میں کلیات تو ملتے ہیں، مگر جزئیات مفقود ہیں۔ ایرانی پروانوں کی طرح مختلف پھولوں کے دل دادہ ہیں۔ مگر پروانوں کو باغ کی پوری کیفیت سے کیا واسطہ ہے؟ چنانچہ فلسفۂ ایران کی تجلیات فارسی غزلیات میں بکھری پڑی ہیں اور ان کی کتبِ فلسفہ میں کوئی مربوط چیز کم ہی ملتی ہے پھر بھی انھوں نے قدیم و جدید مابعد الطبیعیاتی

---

[3] اصل انگریزی جملے میں یوں ہے: EXCELLENT LITTLE BOOK

[4] سیرِ فلسفہ در ایران، طہران طبع سوم ۲۵۳۴ ش/۱۹۷۵ء، صفحہ ۶۸۔

© rasailojaraid.com

ایرانی افکار اور تصوف ایرانی کے بارے میں پہلی بار ایک منظم اور صبر آزما تحقیق کی ہے۔ کتاب پڑھنے والا اقبال کے "دیباچے" کی صداقت کا قائل ہو کے رہے گا۔

۳۔ شذراتِ فکر (انگریزی)

اقبال نے ۱۹۱۰ میں "اسٹرے ریفلکشنز" کے نام سے کچھ یادداشتیں مرتب کی تھیں جنھیں ۱۹۶۱ میں لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔ "شذراتِ فکرِ اقبال" کے نام سے ۱۹۷۳ میں ان کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ (لاہور، مجلس ترقی ادب)۔ مگر ان یادداشتوں کا کوئی دیباچہ ہے نہ سرنامہ۔

۴۔ مثنوی "اسرارِ خودی" (۱۹۱۵) اور مثنوی "رموزِ بیخودی" (۱۹۱۸)

یہ دونوں مثنویاں ۱۹۲۳ سے یک جا ہیں اور "اسرار و رموز" کہلاتی ہیں۔ اقبال نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن پر جو دیباچہ لکھا، دوسری اشاعت میں اسے حذف کر دیا، مگر اس کی جگہ ایک مختصر توضیح نامہ چھپوایا۔ رموزِ بیخودی کی اشاعتِ اول (۱۹۱۸) کے ساتھ بھی اقبال نے ایک مختصر دیباچہ شائع کروایا تھا۔ اسرارِ خودی کی تیسری اور رموزِ بیخودی کی دوسری اشاعت "اسرار و رموز" کے نام سے یک جا ہوئی اور تمام دیباچے حذف کر دیے گئے۔

مثنوی اسرارِ خودی کا پہلا دیباچہ کوئی چھ صفحات پر مشتمل ہے۔ اگرچہ خودی کے مفصل فلسفے کی ترجمانی اس مختصر دیباچے سے نہیں ہو سکتی، تاہم یہ چھ صفحات اردو ادب کی مایۂ ناز تحریریں میں شامل کیے جانے کے لائق ہیں۔ آغاز اس طرح ہے:

"یہ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ "خودی" یا "انا" یا "میں"، جو اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریب تخیل یا دروغ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکما و علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا، جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ اسی نتیجے کی طرف مائل رہیں کہ انسانی "انا" محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی"۔ ۵

مندرجہ بالا چھ جملے پہلے پیراگراف کی تکمیل کرتے ہیں۔ بعد میں وہ ہندوؤں کے فلسفۂ ترکِ عمل پر روشنی ڈالتے ہیں، جس میں سری کرشن اور سری رام نوج نے اصلاحات کیں اور ترکِ عمل کو نتائجِ عمل سے بے تعلقی بتایا، مگر سری شنکر کے منطقی فلسفے نے پھر اسے ایک گورکھ دھندا بنا کے رکھ دیا۔ سری شنکر نے گیتا کی تفسیر جس رنگ میں کی ہے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے اسی انداز میں قرآن مجید کی تفسیر کی اور نظریۂ وحدت الوجود کو اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا کے رکھ دیا۔ اس نظریے نے مغربی ایشیا کے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو سخت دھچکا لگایا۔ فارسی شعرا، جیسے اوحدالدین کرمانی اور شیخ فخرالدین عراقی نے وحدت الوجود کا راگ اس انداز سے چھیڑا کہ جزء اور کل کی بحث ہی ختم ہوگئی اور کل ہی کل کی کارفرمائی ہوگئی۔ علما میں سے شیخ ابن تیمیہؒ نے اس نظریے کے خلاف کسی قدر موثر آواز اٹھائی۔ شیخ واحد محمود بھی اس عقیدے کے خلاف تھے مگر ان کی کتب ناپید ہیں اور دبستان المذاہب، سے ان کے عقائد کا اجمالی حال معلوم ہوتا ہے، مگر علما کی خشک اور منطقی دلیلوں سے شعرا کی دل آویزیوں کا توڑ نہیں ہوسکتا تھا۔ ہندو فلسفیوں نے دماغ کو مخاطب کیا تھا، مگر عجمی شعرا نے دل کو آماج گاہ بنایا اور وحدت الوجودی تعبیرات کے ذریعے مسلمانوں کو ذوقِ عمل سے یکسر محروم کرکے رکھ دیا۔ یہاں اقبال، لذتِ سکون و بے عملی کے حامل دو شعر نقل کرتے ہیں:

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را — تنزا کتہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت — بیدل

آنکھ آئینے کی پیدا کر، دہن تصویر کا — دیکھ جو سامنے آجائے، منہ سے کچھ نہ بول — امیر مینائی

۵۔ مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۵۳/۱۵۴

© rasailojaraid.com

آخر میں اقبال بتاتے ہیں کہ مغربی اقوام نے بھی وحدت الوجود کے نظریے کو اپنایا تھا، مگر جلد ہی ان کی قوتِ عمل نے اس سے گلو خلاصی حاصل کر لی۔ وہ بیکن اور دیگر مغربی فلاسفہ کی تعریف کرتے ہیں جنھوں نے لوگوں کو قوتِ عمل سے روشناس کروایا اور ہالینڈی فلسفیوں کے وحدت الوجودی تصورات کی بیخ کنی کی۔ آخر میں لفظ "خودی" کے نئے معانی پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ محسن تبریزی (م: ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) کے اس شعر سے استشہاد کیا ہے:

غریقِ قلزمِ وحدت، دم از خودی نزند   بود محال کشیدن میانِ آب، نفس

اس مثنوی کی دوسری اشاعت کا دوسرا دیباچہ چند جملوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اقبال نے مثنوی کے اشعار میں ترمیم و اضافے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے خواجہ حافظ کے خلاف اشعار حذف کر دیے اور ان کی جگہ ادب برائے زندگی کے نظریے کے حامل نئے اشعار رکھ دیے تھے۔ رموزِ بیخودی کے مختصر دیباچے میں انھوں نے قومی تاریخ، ملی مفادات اور قومی زندگی کے ارتقا کے اصولوں پر مختصر انداز میں روشنی ڈالی ہے[۵۶]

مگر ان مثنویوں کے "سرنامے" اور "تمہیدیں" (بزبانِ شعر) بھی توجہ طلب ہیں۔

سرنامے میں صاحبِ خودی انسان کی تلاش کے تلازمے میں اقبال نے رومی کی ایک غزل کے تین شعر نقل کیے ہیں۔ دیوانِ کبیر رومی کے یہ اشعار اقبال کے ہاں دو تین دوسرے مواقع پر بھی منقول ملتے ہیں:

دی شیخ با چراغ همه گفت گرد شهر   کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زین همرهانِ سست عناصر دلم گرفت   شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم که یافت می نشود جسته ایم ما   گفت آنکه یافت می نشود آنم آرزوست

"تمہید" کے افتتاحیے میں نظیری نیشاپوری (م: ۱۰۲۱ھ/۱۶۱۲ء) کی غزل کا ایک شعر منقول ملتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ میری ہر بات اور ہر کام بامقصد اور نتیجہ خیز ہے:

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی   چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

---

[۵۶] مقالاتِ اقبال، ص ۱۹۱، ۱۹۲۔

© rasailojaraid.com

تمہید میں اقبال نے اپنا دردِ دل بیان کیا، رومی سے اپنی ارادت ظاہر کی اور شاعرِ حیات کے طور اپنا تعارف پیش کیا۔ ۱۹۱۵ء میں بعض قارئین نے ان اشعار کو تعلّی شاعرانہ قرار دیا ہوگا، مگر اب ان کے حقیقت ہونے پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا :

فکرم آن آہو سر فتراک بست　　کو ہنوز از نیستی بیرون نجست
محفلِ رامش گری برہم زدم　　زخمہ بر تارِ رگِ عالم زدم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم　　من نوائے شاعرِ فرداستم
نغمۂ من زاندازۂ تار است بیش　　من نترسم از شکستِ عودِ خویش
چشمۂ حیوان براتم کردہ اند　　محرمِ رازِ حیاتم کردہ اند

مثنوی رموزِ بیخودی کے سرنامے میں بھی رومی کا ایک شعر ہے (مثنوی معنوی سے) اور پیشکش کے آغاز میں عرفی شیرازی (م: ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء) کا ایک بیت :

جہد کن در بیخودی خود را بیاب　　زود تر، و اللہ اعلم بالصواب
منکر نتوان گشت اگر دم زنم از عشق　　این نشۂ من نیست اگر با دگرے ہست

رومی کے شعر کا مدعا یہ ہے کہ خودی اور بیخودی لازم و ملزوم ہیں۔ عرفی نے دعویٰ عشق کی صداقت پر زور دیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نشۂ عشق حقیقت رکھتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ہر کوئی اس سے سرشار ہو۔ ان دونوں اشعار کی معنوی اہمیت مسلّم ہے۔ اقبال نے اسرارِ خودی کی تمہید میں اپنے خادمِ ملتِ اسلامیہ ہونے پر فخر کیا ہے :

من کہ این شب را چو شمع آراستم　　گرد پائے ملتِ بیضا ستم
غلغلہ در باغ و راغ آوازہ اش　　آتشِ دلہا سرودِ تازہ اش
ذرہ کشت و آفتاب انبار کرد　　خرمن از صد رومی و عطار کرد

رموزِ بیخودی کو وہ اس ملتِ اسلامیہ کے حضور ہدیہ و پیشکش کرتے ہیں۔ وہ اس ملت کے شاعر ہیں۔ وہ اس شمع کے پروانے ہیں مگر افسوس یہ ملت خود اپنی اصل سے دور ہوتی جا رہی ہے الا ماشاء اللہ :

رمز سوز آموز از پروانہ ای　　در شرر تعمیر کن کاشانہ ای

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرح عشق انداز اندر جانِ خویش — تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش
بر درت جانم نیاز آوردہ است — ہدیہ سوز و گداز آوردہ است
زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی — ہمچو دل اندر کنارِ ماستی
باز خوانم قصۂ پارینہ ات — تازہ سازم داغہائے سینہ ات

۷۔ پیامِ مشرق (۱۹۲۳)

مفصل نثری دیباچہ اقبال نے اسی کتاب کا لکھا ہے۔ یہ کتاب اقبال نے جرمن شاعرِ حیات گوئٹے (م: ۱۸۳۲ء) کے دیوانِ شرقی و غربی کے جواب میں لکھی ہے۔ اقبال نے شروع میں آیۂ قرآنی ولِلّٰہِ المشرق والمغرب (۲: ۱۱۵) لکھ کر اپنے مشرق و مغرب سے [illegible] ہونے کا اعلان کر دیا۔ گوئٹے دنیا کے مغربی حصے (یورپ) میں پیدا ہوا، اور اقبال مشرقی حصے (ایشیا) میں متولد ہونے کی بنا پہ شاعرِ مشرق ہیں۔ مگر ان شاعرانِ حیات کا پیغام مشرق و مغرب، اور شمال و جنوب کے سب انسانوں کے لیے ہے۔

اقبال نے اس دیباچے میں جرمن ادبیات پر فارسی ادبیات کے اثرات سے بحث کی ہے۔ اقبال نے دیباچہ لکھتے وقت تحقیقی مواد کی کمی کا شکوہ کیا ہے۔ اپنی بحث کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"... ممکن ہے کہ یہ مختصر سا خاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔"

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات ہیں، جرمن ادبیات پر تحریکِ مشرقی کے اثرات کے متعلق ابھی کوئی تو[illegible] تحقیق پیش نہیں کی جا سکی۔ ایک کتاب اور کئی مقالے البتہ لکھے گئے ہیں۔ 'پیامِ مشرق' کے اس دیباچے کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم نے شائع کروایا تھا۔ اس دیباچے اور اسرار و رموز کے دیباچوں کا فارسی ترجمہ راقم الحروف نے چند سال قبل سہ ماہی 'اقبال ریویو' (جنوری ۱۹۷۱)

ے 'ضربِ کلیم'، قطعہ 'شعاعِ امید' کا آخری شعر ہے:
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر — فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں چھپوایا تھا، اور ایرانی مطبوعات میں ان تراجم کے انعکاسات اکثر دیکھے جا سکتے ہیں۔ مدعا یہ کہ علامہ مرحوم نے جس موضوع پر سات آٹھ صفحات میں راہنمائی کی تھی، وہ اب تک تشنہ ہے اور اس سے اقوامِ مشرق کا تساہل عیاں ہے۔

اقبال کے دیباچے کا معتد بہ حصہ گوئٹے اور دیگر جرمن شعرا پر فارسی شعرا کے اثرات سے مربوط ہے۔ اس ضمن میں وہ گوئٹے کی خواجہ حافظ سے شیفتگی کا خصوصی ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح فارسی ادب کے دیگر مشاہیر کے جرمن ادب پر اثرات کے بارے میں انھوں نے کافی شواہد پیش کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمن اور فارسی جاننے والا کوئی محقق اقبال کے فراہم کردہ اشارات کی توضیح سے ایک مفصل کتاب لکھ سکتا ہے۔

یہاں 'پیامِ مشرق' اور 'دیوان مشرقی و مغربی' کے مطالب کا مقائسہ کرنا بے سود ہوگا۔ راقم کے پاس گوئٹے کے دیوان کا فارسی ترجمہ موجود ہے۔ اور اگرچہ اس موضوع پر کافی لکھا جا رہا ہے مگر نئے اسلوب سے کچھ باتیں بیان کرنے کی پھر کبھی کوشش کریں گے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ گوئٹے کے دیوان نے جرمن قوم کے انحطاط کو ختم کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا، وہ بھی یہ کتاب اس امید پر پیش کر رہے ہیں کہ اس سے اقوامِ مشرق خصوصاً مسلمانوں کے انحطاط کو روکنے میں مدد ملے گی۔ یہاں وہ پہلی جنگِ عظیم کی ہولناکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یورپ کے اخلاقی انحطاط کے وہ شاکی ہیں مگر وہ امریکہ کی روش سے خورسند ہیں۔ امریکہ کا حقیقی چہرہ دوسری جنگِ عظیم کے آخری سال (۱۹۴۵) اقبال کی وفات کے کوئی سات سال بعد ظاہر ہوا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط کو عروج و ترقی سے بدلنے کی یہی صورت ہے کہ یہ لوگ اپنے انفس کو بدلیں۔ 'خودی' بدلے تو 'بیخودی' بھی بدل سکتی ہے:

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوامِ مشرق کو محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ (۱۱:۱۳) کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔..؟

"پیامِ مشرق" افغانستان کے ایک سابق فرمانروا امیر امان اللہ خاں مرحوم (م ۱۹۶۰ء) کے نام معنون کی گئی تھی۔ منظوم پیشکش میں بھی اقبال "پیامِ مشرق" اور "دیوان شرقی و غربی" کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ ایک بند میں وہ عالم اسلام کی ژولیدگی کا بڑے دردمندانداز میں ذکر کرتے ہیں۔ عرب، مصریوں سمیت احسانِ زیاں سے محروم ہیں۔ تورانی (جماہیر روس کے مسلمان) بے حس ہیں۔ عثمانی ترک داخلی اور خارجی فتنوں سے نبرد آزما ہیں۔ ایرانی سوزِ حیات سے محروم ہیں اور برصغیر کے مسلمانوں کو پیٹ، دین سے زیادہ عزیز ہے۔

ان کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم و فنون سیکھیں، مگر اسلامی تعلیمات سے متمسک بھی ہوں۔ ان کے حکمران عدلِ فاروقی، فقرِ حیدریؓ، شہنشاہ مراد عثمانی اور حضرت سلمانؓ فارسی کی درویش مشربی کے مظہر ہوں، مگر یہ اوصاف عاشقانِ رسولؐ کو ہی میسر آسکتے ہیں:

سروری در دینِ ما خدمت گری است | عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است
قائدِ ملت، شہنشاہِ مرادؒ | تیغ او را برق و تندر، خانہ زاد
ہم فقیرے، ہم شہِ گردوں فقیرے | اردشیرے با روانِ بوذرؓے
غرق بودش در زرہ بالا و دوش | در میانِ سینہ دل موئینہ پوش
آن مسلمانان کہ میری کردہ اند | در شہنشاہی، فقیری کردہ اند

۶- بانگِ درا - (۱۹۲۴)

اس کتاب کا جامع دیباچہ سر شیخ عبدالقادر (م: ۱۹۵۰) نے لکھا۔ مرتبِ کتاب خود اقبال تھے۔ انھوں نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا: ۱۹۰۵ تک کا منتخب کلام، قیامِ یورپ کا کلام (۱۹۰۵ سے ۱۹۰۸) اور ۱۹۰۸ سے اشاعتِ کتاب تک کے منتخب اشعار۔ اقبال نے اس کتاب کے لیے سرنامے کے اشعار نہیں لکھے، اور کتاب کے متن سے ایسے اشعار کا استخراج کرنا تکلف ہوگا، البتہ کئی اشعار میں شاعر نے کتاب کا نام (بانگِ درا = گھڑیال کی آواز) استعمال کرکے اپنے پیغام کے بیدار ساز پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

۷- زبورِ عجم (مع مثنوی "گلشن راز جدید" اور "مثنوی بندگی نامہ"): اشاعتِ اول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ "زبورِ عجم" کے اصلی حصے ہیں غزلیات اور غزل نما قطعات اور قطعہ نما غزلیات ہیں۔ اس کے دو ذیلی جز ہیں۔ پہلے جز میں ۵۶ اور دوسرے جز میں ۷۵ غزلیات ہیں۔ اقبال کے دوست چوہدری محمد حسین (م: ۱۹۵۰ء) نے بجا طور پر زبورِ عجم کو فارسی غزل کا نقطۂ کمال قرار دیا ہے۔ خود اقبال کو بھی اس کتاب پہ ناز تھا:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم — فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں (بالِ جبریل)

وہ اس کتاب کا ایک ترجمے اور حواشی والا ایڈیشن بھی چھپوانا چاہتے تھے، مگر نا معلوم اس کے مسودے کا کیا بنا؟[۵۸]

"زبورِ عجم" کے دونوں حصوں کی تقسیم کی توجیہ مشکل ہے۔ یہ کہنا کہ پہلے حصے کا خطاب خدا سے ہے، اور دوسرے کا انسان سے، ایک حد تک صحیح ہے، مگر سو فی صدی ایسا نہیں ہے۔ گو توجیہ و تبیین سے ایسا کہا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے سرنامے بے حد معنی خیز ہیں۔ "زبورِ عجم" کے قاری سے فرماتے ہیں:

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولی — طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست — دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

پھر کتاب کے حصۂ اول (خطاب بہ خدا) کے ناظر سے وہ یوں تحدیثِ نعمت کرتے ہیں:

ز برون در گذشتم، ز درونِ خانہ گفتم — سخنِ نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

اس حصے میں ۵۶ غزلیات، قطعات کے آغاز سے قبل ایک ایمان افروز "دعا" بھی ملتی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے کا خطاب انسان سے ہے۔

۸۔ جاوید نامہ: (۱۹۳۲)

اقبال کے اس شاہکار کا ایک ضمیمہ بھی ہے: خطاب بہ جاوید (سخنے با نژادِ نو)
اقبال نے کتاب کی اشاعت اول میں زبورِ عجم کی ایک غزل کے دو شعروں کو سرنامہ بنایا تھا۔

---

۵۸ ملاحظہ ہو مکتوباتِ اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۵۷ء۔ ص ۲۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر بعد کی اشاعتوں سے وہ محذوف ہو گئے ہیں۔

افلاک کا تخیلی سفر کرنے اور ستاروں سے آگے اور جہان ہونے کی بات انھوں نے بانگِ درا اور بالِ جبریل میں بھی کی ہے، مگر جاوید نامہ میں انھوں نے چھ سات افلاک پر اپنے ادبی سفر کا پورا حال لکھا ہے۔ اقبال دوستوں کو لکھتے رہے کہ جاوید نامے کا دیباچہ بڑا دلچسپ ہوگا مگر اس کتاب کا کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ ہاں ایک غیر معمولی فکر انگیز مناجات ضرور ہے۔

۹۔ اسلام میں فکرِ مذہبی کی تشکیلِ نو (انگریزی ۱۹۳۰، ۱۹۳۴)

کتاب کے پہلے چھ خطبے یا مقالے تھے اور بعد میں ایک خطبے یا مقالے کا اضافہ کیا گیا۔ اقبال نے یہ لیکچر حیدر آباد دکن، علی گڑھ اور مدراس میں دیئے تھے۔ اس مجموعے کے مختصر دیباچے میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے "فکر" کے ساتھ "عمل" پر بڑا زور دیا ہے، مگر کچھ لوگ تفکر و تعقل کے مقابلے میں بہتر پیش کر سکتے ہیں۔ ان خطبات میں انھوں نے جدید تر علوم و فنون کی روشنی میں اسلامی تفکر و تفلسف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ انسانی فکر لا محدود ہے، اس لیے انھوں نے جو کچھ یہاں کہا ہے، آئندہ اس سے بہتر کہا جا سکے گا اور ان کے نظریات اس سمت میں کوئی حرفِ آخر نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ صوفیا نے بڑے عمدہ افکار پیش کیے تھے، مگر دورِ متاخر کے صوفیا مقلد بن کر رہ گئے اور نئے علوم و فنون کی کسی بات کو اپنے فکر و عمل میں سمو نہ سکے۔ اقبال مذہب کو کھینچ تان کر سائنس کے قالب پر فٹ کرنے کے سخت مخالف تھے۔ فرماتے ہیں کہ دین اسلام حقیقت ہے، مگر سائنس تلاشِ حقیقت میں معروف ہے اور اس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ موجودہ علوم و فنون کی روشنی میں اسلام کی حقانیت کی توجیہ کر سکیں، مگر یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری رہے گا اور اس طرح دین اسلام اور سائنس قریب سے قریب تر ہوتے جائیں گے۔

سائنس اور دین کے کلیات کے بارے میں جو عام سوالات اٹھتے رہتے ہیں، اقبال نے دیباچے میں ان سب کا جواب دے دیا ہے۔

۱۰۔ بالِ جبریل: (۱۹۳۵ء)

یہ اقبال کے اردو کلام کا دوسرا دیوان ہے۔ اس میں ایسی پاکیزہ غزلیات اور منظومات ہیں

© rasailojaraid.com

جن پر اہلِ جہان ناز کر سکتے ہیں۔ اقبال نے سنسکرت زبان کے ایک قدیم درویش شاعر بھرتری ہری کے ایک اشلوک کو 'سرنامہ' بنایا اور 'بالِ جبریل' کے لطیف اور بلند معانی کی طرف قارئین کو توجہ دلائی ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

مگر 'سرنامے' کا پہلا شعر مندرجہ ذیل ہے۔ شاعر کا مطمحِ نظر اور اس کی وسعتِ افکار دیکھنے کے لیے اس شعر پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ وہ تغیر، انقلاب اور 'جہانِ نو' کا طالب تو رہا ہی ہے۔ اس کے نزدیک 'جہانِ نو' نئی زمین نہیں، بلکہ نئے افکار و تصورات کا نام ہے۔ یہاں وہ 'خورشید کا سامانِ سفر اور زادِ راہ' تازہ بتازہ کرنے اور شام و سحر کے نفسِ سوختہ کو تازہ دم کرنے کا عزم ظاہر کر رہے ہیں۔ راقم الحروف نے کم از کم ایسا بلند آہنگ اور وسیع المعانی شعر اقبال کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاں نہیں دیکھا:

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

اقبال نے اس کتاب کی بعض نظموں کے سرنامے بھی لکھے ہیں، مثلاً نظم 'ذوق و شوق' ہے جس کا سرنامہ بوستانِ سعدی کا یہ شعر ہے:

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

اقبال مؤتمرِ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ۱۹۳۱ء میں فلسطین تشریف لے گئے تھے۔ 'ذوق و شوق' کے نام کی ایمان افروز اور رقت زا نظم اسی سفر کا ارمغان ہے۔

۱۱۔ مثنوی 'مسافر' (۱۹۳۴ء) اور مثنوی 'پس چہ باید کرد' (۱۹۳۶ء)

'مسافر' پہلی اشاعت کے بعد 'پس چہ باید کرد' کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہے۔ پہلی مثنوی افغانستان کے سفر کی یادگار ہے۔ (اکتوبر و نومبر ۱۹۳۳ء)۔ دوسری مثنوی، اسلامی تعلیمات کی آئینہ دار ہے۔ یوں تو دونوں مثنویاں پیغامِ اسلامی سے مملو ہیں، مگر دوسری مثنوی بے حد موثر اور موثر کتاب ہے۔ اسی مثنوی کے 'سرنامے' نے دراصل مجھے یہ مضمون لکھنے کی تحریک کی ہے:

سپاہِ تازہ برانگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

زمانہ ہیچ نداند حقیقتِ او را
جنوں قباست نہ موزوں بقامتِ خرد است

© rasailojaraid.com

اقبال نے 'عشق' کو 'عقل و خرد' کو ہر جگہ ترجیح دی ہے۔ اس کی وجوہ یہاں عرض نہیں کی جا
نیں۔ مثنوی میں انھوں نے چونکہ اسلامی اور غیر اسلامی نظامِ حکومت، حقیقی فقر و حریت، کلمہ
کے نفی و اثبات کے رموز، اسرارِ شرع، سیاستِ حاضرہ، افتراقِ اہلِ ہند اور نفاقِ امت
لکھا ہے اور 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' کے زیرِ عنوان اقوامِ ایشیا کو یورپ والوں کے
ف مقاومت کرنے کا پیغام دیا ہے، اس لیے اس سرنامے کی معنی خیزی عیاں ہو جاتی ہے،
ر توضیح کی ضرورت نہیں رہتی۔

۱۔ ضربِ کلیم۔ (۱۹۳۶ء)

اس کتاب کا نام پہلے 'صورِ اسرافیل' تجویز ہوا تھا۔ اقبال نے اس ترکیب کو بھی اپنے کلام میں
استعمال کیا ہے، مگر کتاب کا نام بہرحال 'ضربِ کلیم' رکھ لیا گیا۔
'صورِ اسرافیل' نام کا ایک اخبار ان دنوں ایران سے نکلتا تھا اور اب تہران کی ایک سڑک کا
بھی نام ہے۔ 'ضربِ کلیم' بقول اقبال عصرِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس بظاہر مختصر
کتاب میں مضامین کی بے حد رنگا رنگی ہے اور اقبال کا اعلانِ جنگ فراعنہ مشرب قوتوں کے
خلاف ہے۔ اس لحاظ سے نام بے حد مناسب اور سرنامہ مناسب تر ہے کہ:

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے شوق مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اس کے بعد شاعر نے ناظرین سے خطاب فرماتے ہوئے سرنامے کے تین مزید اشعار لکھے،

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

آگے 'تمہید' ہے جس کے ایک شعر میں شاعر اپنا مقامِ شاعری واضح کرتا ہے:

عطا ہوا خس و خاشاکِ ایشیا مجھ کو کہ میرے شعلے میں ہے سرکشی و بے باکی

'تمہید' کا دوسرا حصہ ایک قسم کی خود کلامی (مونولاگ) ہے جس میں شاعر [illegible]
کرتے ہوئے اپنے آپ سے مصروفِ گفتگو ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو — تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے — وہ پر شکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خرسند

'ضربِ کلیم' کا سر نامہ اور تمہید اس کے جنگ ترنگ آہنگ کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ کتاب کے نام کی ترکیب بھی چند مقامات پر موجود ہے، جیسے:

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا (فنونِ لطیفہ)
چھوڑ یورپ کے لیے رقصِ بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللّٰہی (رقص)

۱۳۔ ارمغانِ حجاز۔ (۱۹۳۸ء)

اقبالؒ کی یہ آخری تصنیف ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ اس کے کوئی ۲/۳ حصے کو فارسی کلام نے محیط کر رکھا ہے اور باقی کو اردو نے۔ فارسی کا کلام دوبیتیوں کی صورت میں ہے البتہ چند شعر تضمین شدہ ملتے ہیں اور غزل و قطعہ کی صورت کے چند اشعار بھی ہیں، مگر انھیں اردو اشعار والے حصے میں سمویا گیا ہے۔ کتاب کا نام حصہ 'حضور رسالت مآبؐ' کے عنوان کی مناسبت سے ہے۔ اس حصے کی دوبیتیوں میں عشقِ رسولؐ کی حدت و شدت دیکھی جا سکتی ہے۔ اقبال اپنی وفات سے کوئی ایک ڈیڑھ سال پہلے سے حج بیت اللہ شریف کے لیے تیاریاں کر رہے تھے، مگر بیماری و نقاہت نے ان کی آرزو پوری نہ ہونے دی۔ لیکن اس دوران وہ عالمِ خیال میں اپنے آپ کو سرزمینِ حجاز میں محسوس کرتے رہے۔ یہ دوبیتیاں خصوصاً 'حضورِ حق تعالیٰ' اور 'حضورِ رسالت مآبؐ' کے عنوان والی، اسی عالم میں لکھی گئی ہیں۔

کتاب کے اردو حصے کا سر نامہ نہیں، مگر فارسی حصے کے ہر ذیلی عنوان کا سر نامہ ملتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ 'حضور حق تعالیٰ' کا سر نامہ اس امر کا غماز ہے کہ شاعر یکا و تنہا اور زادِ راہ کی پروا کیے بغیر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا عازم ہو چکا ہے:

خوش آں راہی کہ سامانے نہ گیرد — دلِ او پندِ یاراں کم پذیرد
بہ آہِ سوزناکش سینہ بکشائے — ز یک آہش غمِ صد سالہ میرد

مگر عاشقِ رسولؐ کی تمام تر توجہ مدینہ منورہ پہنچنے پر مبذول رہتی ہے۔ اس لیے اس حصے کی آخری دوبیتی یوں ہے:

© rasailojaraid.com

بدن وا ماند و جانم در رنگ و بوست سوئے یثرب کہ بطحا در رہِ اوست
تو باش ایں جا و با خاصاں بیامیز کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

(حضور رسالت مآبؐ) کے سرنامے میں اقبال نے آٹھویں صدی ہجری کے ایک شاعر عزتؔ بخاری کا عشق آموز شعر نقل کیا ہے کہ :

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

اس حصے میں عاشقِ رسولؐ شاعر کی عرض داشتیں خصوصی طور پر محتاط اور مؤدبانہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ دیگر سرناموں کے نمونے لکھ کر اس گزارش کو ختم کیے دیتے ہیں :

سرنامۂ حضور ملت :

مجو از من کلامِ عارفانہ کہ من دارم سرشتِ عاشقانہ
سرشکِ لالہ گوں را اندریں باغ بیفشانم چو شبنم دانہ دانہ

سرنامۂ حضور عالم انسانی :

آدمیت احترامِ آدمی با خبر شو از مقامِ آدمی

سرنامۂ یارانِ طریق :

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم قمارِ زندگی مستانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

(بقیہ تاثرات)

اور اسلامی تعلیم کے سراسر منافی ۔ !

اگر ہم اسلام کی اس چھوٹی سی تعلیم پر عمل کریں تو بہت بڑے بڑے معاشرتی مسائل آسانی سے حل ہو سکتے ہیں اور گھر کی چار دیواری سے لے کر اوپر کی سطح تک امن و امان کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

مسلم ثقافت ہندوستان میں

محمد عبدالمجید سالک

اس کتاب میں بڑی وضاحت اور تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برعظیم پاک و ہند کو تقریباً ایک ہزار سال تک کن کن برکات سے مالا مال کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ مسلم ثقافت کی بنیادیں کن اصول و عقائد اور اقدار و معیارات پر قائم ہیں اور عہد قدیم کی معاشرتی اور سیاسی ہیئت کی تشکیل میں ان اصول و اقدار نے کتنا حصہ لیا۔ مسلم حکومتوں نے علم و تعلیم، صنعت و حرفت اور فنون لطیفہ کی سرپرستی میں کس قدر دریا دلی سے کام لیا اور ان کے عہد میں تہذیب و ثقافت کو کتنا فروغ ہوا۔ ہندو دھرم کے بنیادی عقائد کو اسلام نے کس طرح متاثر کیا اور ان اثرات کی پیدا کردہ اصلاحی تحریکوں نے عوامی زندگی اور مقامی معاشرے پر کیا اثر ڈالا۔ مسلمانوں کا دورِ عروج ختم ہونے کے بعد تجدید و اصلاح کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں۔ شاہ ولی اللہ اور سید احمد خاں کی تحریکوں کے کیا کیا نتائج نکلے۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند میں دینی و سیاسی بیداری پیدا کر کے کس منزل کی طرف ان کی رہنمائی کی اور قائد اعظم نے کس طرح مسلمانوں کو متحد و منظم کیا اور تحریکِ پاکستان کو کامیاب بنا کر مسلم ثقافت کی تاریخ میں ایک نئے اور درخشاں باب کا آغاز کیا۔

صفحات ۶۱۱ قیمت ۳۰ روپیہ

انتخابِ حدیث

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

یہ کتاب ان احادیث کا مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ کی تشکیلِ جدید میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے اور اس کا سلیس ترجمہ بھی درج ہے۔ یہ مجموعہ حدیث کی چھ کتابوں کا خلاصہ اور بے مثل انتخاب ہے۔

صفحات ۲۰ + ۴۴۴ قیمت ۳۵ روپیہ

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

© rasailojaraid.com